ڈاکٹر عابد سیال

اردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

The Progressive movement has left strong imprints on Urdu literature. Like other genres, Ghazal was also influenced. These influences have been both negative and positive. This article is an attempt to determine and analyze these impacts.

انیسویں صدی کے وسط ہی سے غزل کے مقابلے میں نظم کو بہتر صنفِ شعر کے طور پر پیش کرنے کی کوششیں کسی نہ کسی صورت میں شروع ہو چکی تھیں۔ انجمن پنجاب نے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پہلے حالی کے اعتراضات اور پھر جوش، کلیم الدین احمد اور دیگر ناقدین کی تحریروں نے مل کر غزل کے خلاف باقاعدہ ایک محاذ کی صورت اختیار کر لی۔ ترقی پسند تحریک کے تشکیلی دور میں بھی یہی اثرات ادبی فضا میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ خود ترقی پسند نظریے کے اہداف کے حصول کے لیے بھی اس نظریے کے پیروکاروں نے غزل کو رجعت پسند صنفِ شعر قرار دیتے ہوئے اسے رد کیا اور نظم کو ذریعۂ اظہار کے طور پر اپنانے پر زور دیا۔ اگرچہ تحریک کے آخری دور میں ترقی پسندوں نے غزل کی طرف مراجعت کی، تاہم چند ایک شعرا کو چھوڑ کر مجموعی طور پر اس تحریک کا رویہ غزل کی مخالفت کا ہی رہا۔ چنانچہ ڈاکٹر خالد علوی لکھتے ہیں کہ ''ترقی پسند تحریک کے بعض مفتیانِ دین نے غزل کو فرسودہ اور جاگیردارانہ نظام کی پروردہ صنفِ سخن کہہ کر غزل کے تابوت میں کیل ٹھونکنے کی ابتدا کی''۔(۱)

ترقی پسندوں نے صنفِ غزل پر مختلف نوعیت کے اعتراضات کیے۔ اس تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہی اختر حسین رائے پوری غزل کی ہیئت اور اس کی داخلی خصوصیات پر یہ رائے دیتے ہیں:

> ''غزل گوئی میں اظہارِ واردات کا دائرہ اتنا محدود رہ جاتا ہے اور قافیہ و ردیف کے ساتھ کیفیت کی یک رنگی کا وہ عالم ہوتا ہے جیسے کوئی مشین ایک رفتار سے ایک سی آواز پیدا کرتی چلی جا رہی ہے۔ اس صدی میں غزل گوئی کا زوال اور نظم کی اٹھان کا براہِ راست تعلق ہماری معاشرت کے تغیر سے ہے۔''(۲)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

Scanned by CamScanner

''دورِ جدید کا ادب بڑی حد تک زندگی کا ترجمان ہے اور غزل جیسی داخلی صنف کا زوال اور نظم جیسی واقعیاتی صنف کی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کا ادیب جذبات و خیالات میں ارتباط قائم رکھنا اور ادب کے ذریعے زندگی کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔''(۳)

اختر حسین رائے پوری کے اس موقف کا لبِ لباب یہ ہے کہ غزل کی ہیئت ایک طرح کا میکانکی نظام رکھتی ہے۔ اس میں واردات کے اظہار کی گنجائش کم ہے اور اس میں 'واقعے' کا بیان نہیں ہوسکتا۔ اس میں جذبات و خیالات کا اظہار بے ربط ہے لہٰذا یہ زندگی کی خدمت سے معذور ہے۔ عابد حسن منٹو کا کہنا ہے:

''غزل کے اپنے حدود ہیں۔ یہی حدود شاعر کو اپنے شعور کے آزادانہ اظہار کا موقع نہیں دیتے، چنانچہ اصلاح کے درجہ تک کے خیالات تو شاید غزل کے نئے انداز میں رچ بس جائیں، لیکن انقلاب کی سطح کا فکر یقیناً نئے پیمانے تلاش کرے گا۔''(۴)

یعنی غزل کی ہیئت میں انقلابی فکر کا داخل کرنا ممکن نہیں۔ یہ ساری باتیں دراصل اسی خواہش کے روپ ہیں کہ ''ادب کا فرضِ اولین یہ ہے کہ دنیا سے قوم، وطن، رنگ، نسل اور طبقہ و مذہب کی تفریق کو مٹانے کی تلقین کرے اور اس جماعت کا ترجمان ہو جو اس نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر عملی اقدام کر رہی ہو''۔(۵) 'تلقین کرنا' اور 'جماعت کا ترجمان ہونا' ہی دراصل ایسی ذمہ داریاں ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا غزل جیسی صنف کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہی ترقی پسندوں کا اعتراض ہے اور یہی غزل کا اختصاص۔ چنانچہ شمیم احمد لکھتے ہیں کہ ''غزل سے صرف وہی شخص لطف اندوز ہوسکتا ہے جو نہ صرف خود آگاہ ہو بلکہ تہذیبِ نفس کی بہترین سطح پر فائز ہو''۔(۶) ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ترقی پسند شاعری میں صاف اور سیدھے مقاصد، یک رخے جذبے، عمومی تشبیہیں اور بے رنگ و سادہ اندازِ بیان ہوتا ہے اور یہ جلد سمجھ میں آنے والی ہوتی ہے جبکہ غزل انتہائی مہذب جذبے اور خیال کے بنیادی تاثر کی سب سے ارتفاع پذیر شکل کا نام ہے اس لیے اس کے سمجھنے کے لیے تہذیب یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس بحث سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ترقی پسند شعراء غزل کو پوری طرح کبھی نہ سمجھ پائے کیونکہ یہ ایک مخصوص معاشرے اور تہذیب کی آئینہ دار ہے جس سے واقف ہوئے بغیر غزل کو سمجھنا محال ہے۔

غزل کی اس مخالفت کی ایک وجہ ترقی پسندوں کے نزدیک یہ ہے کہ ان کے بقول غزل جاگیردارانہ عہد کی پیداوار ہے اور جاگیرداری سماج کی نمائندہ ہے، ایسا سماج جس نے صدیوں تک محنت کش طبقے کا استحصال کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ترقی پسند ادب محنت کش طبقے کا نمائندہ ہونا چاہیے۔ اگر بات نمائندگی کی حد تک رہتی تو کسی قدر سمجھ میں آنے والی تھی لیکن اس سے آگے بڑھ کر عقل و شعور کے سرمائے کو مزدور کی ذات میں مرتکز کر دینا باعثِ تعجب ضرور لگتا ہے۔ لہٰذا ممتاز حسین کا یہ قول ترقی پسند تحریک کی فکری سمت کی واضح نشاندہی کرتا ہے:

Scanned by CamScanner

''آج وہ وقت ہے کہ ہم بھی صفِ اعدا کے مقابل اپنے رہبر کو پہچانیں۔۔۔ ترقی پسند روایات کو ڈھونڈیں، اس انسان کو ڈھونڈیں جس نے زخموں سے چور ہو کر بھی اپنی غلامی کو تسلیم نہیں کیا۔۔۔ اس سچائی کو ڈھونڈیں جو صفحات سے آزاد ہو کر اپنی حقیقت کو منواتی رہی۔ اور یہ کام ہم صرف مزدور طبقے کی قیادت ہی میں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ طبقہ نہ صرف مستقبل ہی کا امین ہے بلکہ انسانی عقل، شعور کا محافظ بھی ہے۔ آج سرمایہ دارانہ نظام انسانی عقل و شعور کو ڈھا کر بہیمانہ جبلت، جذبۂ عبودیت، شہوانی اور عصباتی جذبات کی تعلیم دے رہا ہے، اس کے برعکس دنیا کا صرف محنت کش طبقہ اور سویٹ روس اور چین کا نیا انسان عقل و شعور، سائنس اور ترقی کی پاسبانی کر رہا ہے۔''(۷)

مزدور کے اس انقلابی کردار اور اس کو اجاگر کرنے کے لیے ادب اور ادیب کی ذمہ داری پر ترقی پسند تحریک کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی طویل بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ اس ضمن میں وارث علوی کا درج ذیل بیان صورت حال کو اس کے پورے تناظر میں دیکھنے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

''آدمی جب رول ادا کرتا ہے تو اس کی پوری شخصیت نہیں بلکہ اس کا صرف ایک پہلو سامنے آتا ہے۔۔۔ جب مزدور انقلابی بنتا ہے تو ٹریڈ یونین آفس جاتا ہے، ہڑتال کرتا ہے، پرچم لہراتا ہے اور گولی کھا کر مر جاتا ہے۔ یہ مزدور کا انقلابی رول ہے۔ رول کا بیان کیجیے، اکہرا کردار سامنے آئے گا۔ لیکن جب مزدور اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے، بچوں سے کھیلتا ہے، ماں کو لے کر اسپتال جاتا ہے، ہوٹل میں بیٹھ کر دوستوں سے باتیں کرتا ہے، دوکان دار سے جھگڑتا ہے، پان کی دوکان پر ایکٹروں اور پہلوانوں کی تصویریں دیکھتا ہے تو وہ کوئی رول ادا نہیں کرتا بلکہ ایک آدمی کے طور پر جی رہا ہوتا ہے۔ سیاسی غیض و غضب کا ادب کردار کی اسی پہلوداری سے صرف نظر کرتا ہے۔ وہ صرف مظلومیت کا ذکر کرتا ہے اور اس طرح انسان کی بنیادی انسانیت سے انکار کرتا ہے۔ وہ آدمی کو اس کے ماحول اور میلیو میں رکھ کر نہیں بلکہ اپنے سیاسی نظریہ کی فریم میں رکھ کر دیکھتا ہے۔''(۸)

ادب کو نظریے کے فریم میں رکھ کر دیکھنے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ صفِ اوّل کے ترقی پسند شاعروں کی غزل کو بھی ترقی پسند ناقدین لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ فیضؔ کی غزل کے بارے میں عابد حسن منٹو کہتے کہ ''اپنے تمام تر رچاؤ اور کلاسیکی انداز کے باوجود فیضؔ کی غزل فیضؔ کی شاعری کی نمائندگی نہیں کرتی۔ فیضؔ کی نمائندگی دراصل اس کی نظمیں کرتی ہیں، جن میں اس کے شعور اور فکر کی پوری پوری کارفرمائیاں نظر آتی ہیں''۔(۹)

اردو غزل پر ترقی پسند تحریک کے اثرات زیادہ تر منفی ہیں اور اس تحریک کے دور میں غزل کو زیادہ

Scanned by CamScanner

فروغ حاصل نہیں ہوا۔ بایں ہمہ کچھ نکات یقیناً ایسے ہیں جن کے حوالے سے غزل موضوعاتی اعتبار سے بعض نئے ابعاد سے آشنا ہوئی۔

ترقی پسند شاعری نے اپنی اساس نظریے کی ترسیل پر رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام فہم اور بیانیہ انداز کی شاعری کو، جو عوامی جذبات کی نمائندہ ہو، زیادہ بہتر گردانا گیا۔ چنانچہ علی سردار جعفری بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ''میں نے اس زمانے کے مشاعروں میں بعض خاصی بھونڈی نظموں کو صرف اس لیے مقبول ہوتے دیکھا ہے کہ وہ عوام کے جذبات کی ترجمان ہوتی تھیں''۔(۱۰) اس رجحان کی مخالفت کرنے والوں کو وہ قدامت پرست قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''قدامت پرست عناصر اسے عوام کی بدمذاقی پر محمول کرتے تھے کہ اب فن کی کوئی قدر باقی نہیں رہ گئی ہے اور ادب پروپیگنڈا بن گیا''۔(۱۱) یہ بیانیہ انداز غزل کے رمزیہ پیرایۂ اظہار سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لہٰذا غزل میں ایسی شاعری نے راہ پائی جو معنی کے لحاظ سے اکہری اور اسلوب کے اعتبار سے سپاٹ تھی۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر (مجازؔ)

مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا (ساحرؔ لدھیانوی)

غلام رہ چکے توڑیں یہ بندِ رسوائی
خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں (مجروحؔ سلطان پوری)

شرم آتی ہے کہ اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گزارہ ہی نہ ہو (جاں نثار اخترؔ)

غزل کے مخصوص دھیمے اور معتدل مزاج کے برعکس ترقی پسند شعرا نے اسے مشتعل جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں ایسی شاعری وجود میں آئی جس میں بلند آہنگی اور نعرے کا رنگ موجود تھا۔ انیس ناگی لکھتے ہیں کہ ''بیشتر ترقی پسند شعرا نے مفروضوں اور نعروں کی شاعری کی۔ ان کے پاس زندگی کی تفسیر کے حوالے تو موجود تھے مگر انھوں نے اس قدر انتہا پسندی سے کام لیا کہ شاعری اور صحافت کی حدود میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا''۔(۱۲) اس میں زیادہ قصور شعرا کا بھی نہیں کیونکہ طے شدہ عناصرِ ترکیبی کے نتیجے میں اعلیٰ درجے کی غزل کہنا شاید ممکن ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر بشیر بدر لکھتے ہیں:

''یہ سعادت بزورِ بازو نہیں ہے کہ ترقی پسندی پر بھی آنچ نہ آئے اور شاعر غزل کا اچھا شعر کہہ لے۔ مقررہ مضامین، طے شدہ نتائج، ابہام سے پرہیز، استعارے سے گریز کی وجہ سے، اور سب کے فوری طور پر سمجھ آنے کی شرط کی وجہ سے اکثر

Scanned by CamScanner

خالص ترقی پسند غزل میں خطابت اور بیانیہ شاعری سے آگے بڑھنے کے امکانات نہیں ہوتے۔'' (۱۳)

؎ یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم یہ مال و حشم سب اپنے ہیں (فیض احمد فیض)

؎ یوں زمیں سے خون کے شعلے اٹھیں گے کب تلک
ہاں اٹھا، پرچم اٹھا، اے ہمتِ مردانہ سرخ (جاں نثار اختر)

؎ دیکھو کہ وہ سارے محنت کش برسوں کی نیند سے جاگ اٹھے
سمجھو کہ زمانہ بیت گیا سنسار تھا جب دھنوانوں کا (جمیل ملک)

؎ شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں (معین احسن جذبی)

غزل میں ترقی پسند شعرا کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے غزل میں سماجی شعور کی آمیزش کو زیادہ کیا اور غزل میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ سیاسی بے اعتدالیوں، عصری حقائق اور صداقتوں کے کھلے اظہار کو اپنے دامن میں جگہ دے سکے۔ ابتدائی دور میں پیدا ہونے والا نعرہ بازی کا رویہ آگے چل کر بعض شعرا کے ہاں جب معتدل ہو کر غزل کے مزاج سے ہم آہنگ ہوا تو انھوں نے غزل کا دامن ایسے شعروں سے بھر دیا جو اعلیٰ تخلیقی سطح پر پہنچتے ہیں۔ غزل کے پرانے استعاروں کو نئے مفاہیم سے آشنا کرنے کے ساتھ ساتھ بعض شعرا نے نئے استعارے بھی تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند تحریک نے غزل کو موضوعاتی وسعت بخشی۔ ایسے موضوعات جنھیں پہلے غزل کی اقلیم سے خارج سمجھا جاتا تھا، ترقی پسند شعرا نے انھیں اپنے تخلیقی تجربے سے گزار کر غزل کے لیے قابلِ قبول بنایا۔

؎ کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب بام میں کمتر جاتی ہے (فیض)

؎ قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے (مخدوم)

؎ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا (مجروح سلطان پوری)

؎ کیا خوب ارتقائے چمن کا اصول تھا
ہر شاخِ گل صلیب تھی، ہر گل رسول تھا (ظہیر کاشمیری)

Scanned by CamScanner

ہر شمع سے لپٹی ہوئی زنجیر دھوئیں کی
اس دور میں پُر پیچ ہر اک راہگذر ہے (خلیل الرحمٰن اعظمی)

ترقی پسند شعرا نے غزل میں رجائیت اور حوصلہ مندی کے لہجے کو فروغ دیا۔ خوش گوار مستقبل کی امید رکھنے اور اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کر کے دنیا کو بدل دینے کے عزم کے حامل اس لہجے کی ابتدا اقبال کی غزل سے ہوتی ہے۔ ترقی پسند شعرا نے اس آواز کو (اگرچہ انقلاب کے اپنے مخصوص معنوں میں) عام کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے (فیضؔ)

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ میں نے بھلا دیا (فیضؔ)

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے (ظہیرؔ کاشمیری)

اگر گھنا ہو اندھیرا اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کا دیپ جلاؤ (احمد ندیم قاسمی)

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے (مجروحؔ سلطان پوری)

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ (مجروحؔ سلطان پوری)

بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ترقی پسند تحریک، علی گڑھ تحریک سے بعض مماثلتیں رکھتی ہے۔ دونوں تحریکوں کا رخ سماج اور اس کی اصلاح کی طرف تھا۔ دونوں مقصدی تحریکیں ہیں۔ دونوں نے فرسودہ روایات اور عقائد سے دامن چھڑانے اور فکری انقلاب برپا کرنے کی سعی کی۔ اصلاحی اور انقلابی کوششیں چونکہ نقطۂ نظر کی پابند ہوتی ہیں اس لیے ان کا اظہار نظم کی نسبت نثر میں زیادہ بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے، چنانچہ دونوں تحریکوں کے زیرِ اثر نثری اصناف نے زیادہ فروغ پایا۔ سماجی بہتری کے معیار کے پیشِ نظر غزل پر اعتراضات کا جو سلسلہ علی گڑھ تحریک کے دور میں شروع ہوا تھا، ترقی پسند تحریک کے دور میں آ کر شدید مخالفت کی صورت اختیار کر گیا۔ لہٰذا ترقی پسندوں کے نزدیک غزل اس قدر معتوب صنفِ سخن

Scanned by CamScanner

ٹھہری کہ ترقی پسند شعرا کے غزل کی طرف مائل ہونے کو رجعت پسندانہ اقدام قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر شعرا جو کسی نہ کسی صورت غزل کہتے رہے، پارٹی کے نقطۂ نظر کی ترویج کے جذبے کے تحت غزل پر تبلیغ و تلقین کا بار ڈالتے اور اسے غیر تخلیقی شاعری کا نمونہ بناتے رہے۔ اور جن چند شعرا نے غزل کے اصل مزاج کو برقرار رکھنے کی سعی کی، وہ ترقی پسند ناقدین کے ہاتھوں غیر ترقی پسند شاعری کا الزام اپنے سر لیتے رہے۔ چنانچہ اس پل صراط سے گزر کر غزل کے اشعار کا بہت کم سرمایہ بچتا ہے جو ترقی پسندی اور ادبی جمالیات دونوں معیاروں پر پورا اترتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے اردو غزل پر مثبت اثرات زیادہ تر ان شاعروں کے ہاں دیکھے جا سکتے ہیں جو تحریک کے عہد میں یا اس عہد کے فوراً بعد میدانِ ادب میں وارد ہوئے اور جو ترقی پسند تحریک سے عملاً وابستہ نہیں تھے چنانچہ نظریے کی جبریت سے آزاد تھے۔ اس میں وہ شعرا بھی آتے ہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے لیکن انھوں نے ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹنے کے بعد کسی قدر آزاد فضا میں اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ ان سب شعرا نے سماجی شعور کی آمیزش، موضوعاتی وسعت، علائم و رموز کی تازہ کاری، رجائی لہجہ اور دیگر ایسے ثمرات سمیٹے جو دراصل ترقی پسند تحریک کی دین تھے۔ یوں ترقی پسند تحریک نے آنے والے دور کی غزل کو ایک نئی توانائی عطا کی۔

حوالہ جات

۱۔ خالد علوی، ڈاکٹر، ''پاکستان میں غزل کے چند اہم رجحانات''، مشمولہ ''معاصر اردو غزل'' مرتبہ: قمر رئیس، پروفیسر، اردو اکادمی، دہلی، طبع اول ۱۹۹۴ء، ص ۱۴۴

۲۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ''ادب اور انقلاب''، نفیس اکیڈیمی، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶

۳۔ ایضاً، ص ۴۹

۴۔ عابد حسن منٹو، ''نقطۂ نظر''، ہلٹی میڈیا افیئرز، لاہور، طبع دوم ۲۰۰۳ء، ص ۳۷

۵۔ اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر، ''ادب اور انقلاب''، ص ۷۰

۶۔ شمیم احمد، ''۲+۲=۵''، قلات پبلشرز، کوئٹہ، طبع اول ۱۹۷۷ء، ص ۱۴۱

۷۔ ممتاز حسین، ص ۴۸، ۴۹

۸۔ وارث علوی، ''تیسرے درجے کا مسافر''، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۴، ۲۲۵

۹۔ عابد حسن منٹو، ''نقطۂ نظر''، ص ۳۷

۱۰۔ علی سردار جعفری، ''ترقی پسند ادب''، ص ۲۰۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۱۲۔ انیس ناگی، ''نیا شعری افق''، جمالیات، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۸ء، ص ۸

۱۳۔ بشیر بدر، ڈاکٹر، ''آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ''، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۴۷

Scanned by CamScanner